حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

آزادی دینی مکاتب ومدارس

ضرورت، افادیت اور نئے چیلنجز

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علم وتعلیم کی اشاعت وعمومیت کی تحریک اور اس کی سعی وجدوجہد تقریباً ہر ملک میں اور تاریخ کے ہر دور میں، کسی نہ کسی درجہ میں خلوص وایثار، سادگی اور جفاکشی اور علمی نمونہ وکردار کے ساتھ متصف ومربوط رہی ہے اور اسی میں ناسازگار حالات، سلطنت ومعاشرہ کے انقلابات، جابر حکومتوں کی موجودگی، طبعی مرغوبات، معاشی ضروریات، اور ہر زمانہ میں ''معیار زندگی'' بے رحم فرماں روائی کے باوجود تعلیم وثقافت (کلچر) کا ہر دور میں کام ہوتا رہا، نوشت وخواند کا دائرہ وسعت اور ترقی اختیار کرتا رہا اور زندگی اور مذہب کی بہت سے حقیقتیں اور صداقتیں ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہیں، اس تاریخی حقیقت کے امتحان وتصدیق کے لئے کہ تعلیمی خدمت کا ہر ملک اور ہر دور میں کسی نہ کسی درجہ میں خلوص وایثار اور سادگی اور جفاکشی سے ربط وتعلق اور باہمی رفاقت رہی ہے، روایتی وعرفی (Traditional) تاریخوں کے بجائے جو سرکار دربار جنگوں اور انقلابات سلطنت اور (سیاسی، انتظامی طور پر) سربرآوردہ اشخاص سے تعلق رکھتی اور انہیں کے گرد گھومتی ہیں، ماہرین علم وفن اور سماجی خدمت گاروں اور مذہبی پیشواؤں کی سوانح حیات اور تذکرے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہزاروں برس سے انسان نسلوں میں (زبان وتہذیب اور مذہب وعقائد کے اختلاف کے باوجود) جو احساسات وتاثرات نسل درنسل منتقل ہوتے رہے ہیں، ان میں ایک ''پیشہ ور'' (Proffessional) اور ''غیر پیشہ ور'' (Non-Proffessional) میں فرق وامتیاز ہے، آخر الذکر (غیر پیشہ ور) کے ساتھ ہمیشہ احترام واعتراف اور عقیدت ومحبت کا تاثر اور تقلید واتباع کا (خواہ اس پر عمل نہ ہو سکے) جذبہ اور شوق وابستہ رہا ہے، فطرت انسانی کے اسی دائمی تاثر وردعمل اور مسلمہ حقیقت کے پیش نظر، ہر دور اور ہر امت میں مبعوث کئے جانے والے پیغمبر نے اپنی قوم میں ہدایت وتبلیغ کا کام شروع کرتے وقت اس کی وضاحت ضروری سمجھی کہ وہ کسی دنیاوی منفعت، مال ودولت اور معاوضہ واجرت کا طالب نہیں، قرآن مجید کی سورۂ شعراء میں حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ میں سے کسی کے تذکرہ میں بھی ان کے اس بیان اور اطمینان دہانی کو نظر انداز نہیں کیا گیا کہ ''میں تم سے کسی دنیاوی منفعت کا امیدوار نہیں'' ہر ایک کے تذکرہ میں اس کا بیان واعلان نقل کیا گیا ہے کہ:

وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

میں تم سے (اس دعوت ونصیحت اور محنت وسعی پر) کسی معاوضہ ومنفعت کا طالب نہیں، میرا معاوضہ وانعام رب العالمین کے ذمہ ہے۔

(۱) پھر جب خدا کا آخری دین اسلام دنیا میں آیا تو اس نے صحیح تعلیم کے کام اعلیٰ درجہ کی عبادت اور تقریب الی اللہ کا ذریعہ اور اس کو انبیاء کی نیابت کا منصب قرار دیا، اس کے نتیجہ میں پورے عالم اسلام میں آزاد دینی تعلیم کا نظام جاری ہوا اور آزاد دینی مدارس ومکاتب کی شکل میں مدرسے اور مکاتب قائم ہوئے اور بالعموم مسجدیں قرآن مجید اور ابتدائی دینیات کی تعلیم کا مرکز بن گئیں، سلاطین وقت کی علمی قدردانی وسرپرستی اور شوق وکوشش کے باوجود اکثر یہ مدارس اور تعلیمی مراکز آزاد رہے اور ان کا براہ راست عوام سے ربط وتعلق رہا اور عوام سے ربط وتعلق کا گہرا نفسیاتی اثر اور فائدہ ظہور میں آیا جو بالکل قدرتی ومنطقی ہے، انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی ادارہ یا تحریک کی امداد میں براہ راست حصہ لیتا ہے (خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو) تو اس کو اس سے ایک نفسیاتی اور جذباتی تعلق اور لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نتیجہ تھا کہ مستحکم اور طویل المیعاد اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور شاہان وقت کی فیاضی اور بعض اوقات دینداری کے باوجود، اس تحتی براعظم کے مسلمانوں کی اسلام سے ارادی وشعوری وابستگی، بقدر ضرورت دینی معلومات اور دینی احکام پر عمل کرنے کا جذبہ، اس آزاد دینی نظام، تعلیم اور انہیں آزاد مدارس کے ایثار پیشہ اور مخلص فضلاء کی سعی وجہد کا نتیجہ ہے، جس میں مسلم سلطنتوں اور فرماں رواؤں کا تقریباً کچھ حصہ نہیں، تاریخ وحقائق کی روشنی میں بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وقت تک نہ صرف اس برصغیر کے مسلمانوں کا بلکہ بیشتر یا تمام حتیٰ کہ عرب ممالک تک کے مسلمانوں کا دین وشریعت سے ربط وتعلق اور ان کی دینی باخبری اور اسلامی ثقافت وتہذیب سے نہ صرف واقف ہونا، بلکہ اس کا حامل اور پرجوش حامی ہونا، انہیں ایثار پیشہ، رضا کار اور کسی حد تک زاہد ومتوکل فضلائے مدارس اور ناشرین علم دین کا رہین منت ہے۔

ان مدارس کے اساتذہ وفضلاء میں سے متعدد اگرچہ اپنے فن کے ماہر اور یگانہ روزگار عالم ہوتے تھے لیکن وہ پورے اعتماد وافتخار کے ساتھ یہ کہنے کے اہل تھا کہ۔

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں غلام طغرل وسنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

اس آزاد دینی تعلیم کا ایک فائدہ یہ تھا کہ سلاطین وقت کے غلط اور بعض اوقات مخالف اسلام اور ماحی دین رجحانات، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دین کی بیخ کنی اور استیصال کی باعزم اور منظم کوششوں کا اثر مسلم معاشرہ پر بالکل نہیں پڑ سکا اور درباریوں اور خوشامدیوں کے ایک مختصر حلقہ میں محدود ہو کر رہ گیا، اس کا ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر کی (جو سلطان ترکی کے بعد اپنے وقت میں دنیائے اسلام کا سب سے طاقتور اور وسیع المملکت بادشاہ تھا) تحریک وحدت

ادیان، تعطیل شریعت اسلامی، بلکہ تنسیخ دین محمدی ﷺ کی منظم اور منصوبہ بند کوشش جس میں اس عہد کے بعض ذکی ترین بلکہ عبقری (Genius) افراد شریک تھے، مسلم معاشرہ پر قطعاً کوئی اثر نہیں ڈال سکی اور جیسا کہ بعض یورپین مؤرخین نے اعتراف کیا ہے، وہ چند درباری اشخاص تک محدود رہی اور مسلمان عوام اس سے کلی طور پر غیر متاثر رہے اور یہ نتیجہ ان حقانی، ربانی علماء و مصلحین اور داعیان دین کا فیض تھا، جس کا اثر عامۃ المسلمین پر نہ صرف سرکاری درباری علماء سے زیادہ بلکہ سلاطین وحکام سے بھی زیادہ تھا اور جن کے بعض افراد کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ؎

جہا نے رادگرگوں کردیک مرد خود آگا ہے

حکومت سے اسی بے نیازی، عامۃ المسلمین سے ربط وتعلق، اور ایثار وجذبۂ قربانی کا نتیجہ تھا کہ جب ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہوا اور مسلمان اقتدار اور اس کے منافع ومواقع سے محروم ہوگئے تو اس دینی تعلیم کے نظام و مراکز پر کوئی گہرا انقلاب انگیز اثر نہیں پڑا، بلکہ ان میں مدارس کے قیام کا ایک نیا جوش و ولولہ پیدا ہوگیا، جو نہ صرف مسلمانوں کو دینی، وہنی وتہذیبی ارتداد سے محفوظ رکھ سکیں، بلکہ (نظم مملکت کو چھوڑ کر) ہر طرح سے اسلامی سلطنت کی قائم مقامی کرسکیں۔

انگریزی حکومت نے اپنے اقتدار وتسلط اور تعلیمی نظام اور سوچے سمجھے منصوبہ کے ذریعہ مسلمانوں کے تعلیمی مراکز کی بقاوحیات کیسر چشموں کو خشک کرنے کی ایسی منظم کوشش کی جس کے بعد ان مدارس اور اس دینی تعلیم کے نظام کا باقی رہ جانا ایک معجزہ سے کم نہیں اور وہ (تاریخی تجزیہ اور فلسفۂ حیات کی رو سے) محض مسلمانوں کے عزم وقوت ایمانی اور شروع سے دینی تعلیم کے آزاد رہنے کا نتیجہ تھا، انگریزی حکومت کے ان انتظامات اور اقدامات کی بعض کڑیاں پیش کی جاتی ہیں جو ایک طویل اور آہنی زنجیر کا جز ہیں جو کسی نظام تعلیم کے ختم کرنے کے لئے بھی کافی ہے۔

آنریبل مسٹر الفنسٹن اور ایف وارڈن نے مسئلہ تعلیم پر ایک یادداشت مرتب کی جس میں حسب ذیل اعتراف موجود ہے:

''ہم نے ہندوستانیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کردیئے اور ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی ترغیب نہیں ہوتی بلکہ اس سے قوم کا علم سلب ہوا جاتا ہے اور علم کے پچھلے ذخیرے نسیاً منسیاً ہوئے جاتے ہیں'' (حکومت خود اختیاری، از مولوی سید طفیل احمد صاحب منگلوری علیگ ایم۔ایل سی ص ۹۵)

ڈبلو۔ڈبلو ہنٹر (W. W. Hunter) نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' (The Indian Musalmans) میں ہندوستانی مسلمانوں کی جائز شکایتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے اور ان کو بجا قرار دیا ہے:

''ان (مسلمانوں کو) شکایت ہے کہ ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لئے اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرہ میں ڈال دیا، ہمارا بڑا جرم ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقات میں بددیانتی سے کام لیتے ہوئے، ان کے سب سے بڑے تعلیمی سرمایہ کا غلط استعمال کیا'' (ہمارے

ہندوستانی مسلمان، مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین، مطبوعہ اقبال اکیڈمی لاہور ص ۲۱۹)۔

سر ولیم ہنٹر نے اپنی اس کتاب میں مسلمانوں کے نظام تعلیم ومدارس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انگریزوں کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پہلے وہ ملک کی سیاسی ہی نہیں، بلکہ دماغی قوت بھی تسلیم کئے جاتے تھے، اس ہندوستانی مدبر کے الفاظ میں جو ان سے بخوبی واقف تھا، ان کا تعلیمی نظام اگرچہ اس نظام تعلیم کے مقابلہ میں کم درجہ پر ہے جسے ہم نے رائج کیا ہے لیکن پھر بھی اس کو حقارت کی نظر سے دیکھنا غلطی ہے، کیوں کہ وہ اعلیٰ دماغی تعلیم و تربیت کا اہل تھا، اس کی بنیادیں بالکل ہی ناقص اصولوں پر نہ تھیں گو ان کے پڑھانے کا طریقہ بہت پرانا تھا لیکن یقینی طور پر وہ ہر اس طریقہ سے برتر تھا جو اس وقت ہندوستان میں رائج تھا، مسلمان اس طریق تعلیم سے اعلیٰ قابلیت اور دنیاوی برتری حاصل کرتے'' (ایضاً ص ۲۵۹)

ڈاکٹر ہنٹر کی اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ آزاد اور غیر سرکاری تعلیم گاہوں کا ذریعہ آمدنی کیا تھا اور وہ کیوں ہر طرح کے ناسازگار حالات کے باوجود نہ صرف زندہ بلکہ مفید اور کارآمد ہے وہ لکھتا ہے:

''ہم نے ان کے (مسلمانوں کے) طریقہ تعلیم کو بھی اس سرمایہ سے محروم کر دیا، جس میں اس کی بقاء کا دارومدار تھا، مسلمانان بنگال کا ہر اعلیٰ خاندان ایسے اسکول کا خرچ بھی برداشت کرتا تھا جس میں خود اس کے اور غریب ہمسایوں کے بچے مفت تعلیم حاصل کر سکتے تھے، جوں جوں صوبہ کے مسلمان خاندانوں پر ادبار چھاتا گیا، یہ خاندانی اسکول کم ہوتے گئے اور ان کے اثرات بھی کم ہوتے گئے زمانہ قدیم سے ہندوستانی شہزادوں کا دستور چلا آتا تھا کہ وہ نوجوانوں کی تعلیم اور خدا کی رضا جوئی کے لئے زمین کے قطعات وقف کر دیتے''۔ (ایضاً ص ۲۶۷)۔

حکومت برطانیہ کی اس منظم و مسلح معنوی وثقافتی نسل کشی (Genocide Cultural) اوقاف کی ضبطی، سرکاری ملازمتوں کیلئے فضلائے مدارس کی نااہلی کے قانون اور اس سب سے بڑھ کر قدیم دینی تعلیم کے متوازی پرائمری اور ہائی اسکولوں کی سطح سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ملک گیر نظام کے قائم کرنے اور ان میں ہر طرح کی کشش اور ترغیب کے پہلو کے موجود ہونے کے باوجود، مسلمان اپنے دین اور اس کی ثقافت (کلچر) اور تہذیب ومعاشرہ سے وابستہ ہیں اور وہ کسی بڑے پیمانہ پر بلکہ قابل ذکر سطح پر بھی دینی، تہذیبی وثقافتی ارتداد کا اس طرح شکار نہیں ہوئے، جس طرح اسپین کے مسلمان زوال حکومت اسلامی کے بعد شکار ہوئے، یہ تنہا آزاد دینی تعلیم اور آزاد مدارس ومکاتب اور ان کے فضلاء، وہاں سے تعلیم پا کر نکلنے والے مفتیوں، قاضیوں، واعظوں اور ائمہ مساجد کا فیض تھا اور انہی کی وجہ سے نہ صرف علوم دینیہ بلکہ قرآن مجید پڑھنے اور یاد کرنے کی صلاحیت، اُردو میں نوشت وخواند کی قابلیت اس نسل تک باقی رہی، اس بنا پر عہد جدید کے نامور ترین مفکر اور ترجمان حقیقت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے مدارس عربیہ ودینیہ پر تنقید کرنے والے ایک مسلمان صاحب قلم کی تنقید پر یہ فرمایا کہ ''ان دینی مدارس کو کچھ نہ کہو، اگر یہ باقی نہیں رہے تو ہندوستان بھی اسپین بن جائے گا''۔

ان مدارس اور ان کے فضلاء کی اس خصوصیت اور اس ملک میں اسلام سے واقفیت اور وابستگی کے تسلسل و بقا میں ان کے عظیم کارنامہ کا بقدر ضرورت اور اضطراراً تذکرہ کرنے کے بعد، ہم ایک دوسرے پہلو کی طرف بھی سامعین، قائدین اور حقیقت پسند اور منصف مزاج محبان وطن کی توجہ منعطف کرانا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں سب سے پہلا اور سب سے بڑا حصہ اسی قدیم نظام تعلیم کے ساختہ پرداختہ فضلاء اور علماء دین کا تھا، آزاد مسلم مفکرین قائدین میں سرفہرست علماء دین ہی تھے، جو سیاسی اور قومی تحریکات میں حصہ لینے کے نہ صرف قائل بلکہ داعی تھے اور سیاست کو مسلمانوں کے لئے (بعض جدید تعلیم یافتہ قائدین کی طرح) ''شجرۂ ممنوعہ'' نہیں سمجھتے تھے، انہیں علماء نے برطانوی حکومت کی مخالفت اور اس کے خلاف جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کے نتیجہ میں مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولوی عبدالرحیم صادق پوری اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کو پورٹ انڈمان روانہ کر دیا گیا، مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ صاحب کا انڈمان میں انتقال ہو گیا اور مولوی محمد جعفر اٹھارہ سال کی قید بامشقت اور جلاوطنی کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے، ان کے علاوہ دوسرے ممتاز اور جلیل القدر علماء کو بھی انڈمان میں جلاوطنی کی سزا دی گئی، جن میں مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مفتی اظہر کریم دریابادی کے نام قابل ذکر ہیں، مولانا فضل حق خیرآبادی کا وہیں انتقال ہوا اور بقیہ دو عالم طویل عرصہ کے بعد وطن واپس ہوئے۔

پھر جب ہندوستان میں تحریک خلافت اور اس کے ساتھ آزادئ ہند کی تحریک شروع ہوئی تو اس میں بھی علماء ہی پیش پیش تھے، اس طویل و نورانی فہرست میں یہاں صرف شیخ الہند مولانا محمود حسن، قیام الدین، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا معین الدین اجمیری، مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید، ابوالمحاسن، مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا نام لینا کافی ہے، ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل، مولانا حکیم نصرت حسین اور مولوی سید وحید احمد کو ۱۹۱۷ء میں مالٹا جلاوطن کر دیا گیا، یہ جماعت ۱۹۲۰ء تک وہیں رہی۔

انگریزوں سے نفرت اور حکومت انگریزی کی مخالفت میں ہر طرح کی سختیاں اور مصائب کے برداشت کرنے کی جس صلاحیت اور ہمت کا ثبوت جماعت علماء نے دیا، اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ہر طرح سے حق بجانب ہوگا کہ دینی تعلیم اور آزاد مدارس میں قربانی و ایثار کا جذبہ عزیمت و عالی ہمتی اور بلند نگاہی پیدا کرنے کی زیادہ صلاحیت ہے اور ملک و قوم کو درپیش مصائب و خطرات کے موقع پر یہی جماعت (جو مادی ترقیات، معاشی آسودگی اور عزت و اقتدار کے حصول سے زیادہ آسانی کے ساتھ صرف نظر کر سکتی ہے) زیادہ کام آنے والی ہے۔

اس کے ساتھ ضمناً اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علم و تحقیق کی آبرو، ذوق مطالعہ اور علم و تصنیف کی راہ میں خود فراموشی اور محنت کوشی انہیں عربی و دینی مدارس سے قائم ہے، ان میں سے ایک ایک آدمی نے اکیڈمی

کا کام کیا ہے، اس سلسلہ میں ان مصنفین کے تصنیفی کارناموں کا ذکر موجب طوالت وملال طبع کا باعث ہوگا۔

ان آزاد دینی مدارس ومکاتب کا یہ احسان اور کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے ہے کہ اس دور میں اب اردو انہیں کے ذریعہ نئی نسل کی طرف منتقل ہورہی ہے اور اس نسل میں اردو نوشت وخواند اور قدیم دینی وعلمی ذخیرہ سے ربط وتعلق و استفادہ کی صلاحیت انہیں مدارس ومکاتب کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے، ورنہ جدید تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والا (اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں کے طلبہ تک) اردو میں تحریر وتصنیف کا کیا ذکر؟ اردو میں پڑھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوتے جارہے ہیں اور اپنے والدین اور سرپرستوں سے ہندی یا انگریزی میں خط وکتابت کرنے پر مجبور ہیں۔

حضرات! گزشتہ بیان اور معروضات سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ کسی ملک میں دین سے وابستگی اور ملت کے تشخص کی بقا حکومت کی ان پابندیوں سے آزاد رہنے اور ان قوانین سے مستثنیٰ ہونے میں مضمر ہے، جو ملک کی مادی ضرورتوں کی تکمیل اور عام نظم ونسق کے شوبوں کے لئے ضروری یا مفید ہوسکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر ذمہ داران حکومت صحیح معنیٰ میں حقیقت پسند اور محب وطن ہوں تو ان کو ہر ایسی کوشش اور ہر ایسے ادارہ کو نہ صرف باقی رہنے کی اجازت دینی چاہیے بلکہ اس کی ہمت افزائی اور قدر دانی کرنی چاہیے، جو ملک میں علم وخواندگی اور ثقافت وتہذیب کی اشاعت وترقی اور ان کی توسیع میں مدد دے کہ اس وسیع، طویل وعریض اور کثیر آبادی کے ملک میں اگر کوئی شخص درخت کے نیچے بیٹھ کر جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے والی خوراک اور بقدر ستر پوشی پوشاک پر قناعت کرتے ہوئے تعلیم وتربیت کا کام کرے تو ہر محب وطن انسان اور علم کے ہر قدر دان کو اس کا نہ صرف خیر مقدم کرنا چاہیے بلکہ اس کا شکر گزار ہونا اور اس پر فخر کرنا چاہیے کہ تمام تر سرکاری وسائل اور زیادہ سے زیادہ تعلیم گاہوں کے قیام اور ان کے لئے اساتذہ کی فراہمی کے باوجود اس ملک کی آزادی کے بڑے حصہ کو خواندہ وتعلیم یافتہ نہیں بنایا جاسکتا، چہ جائیکہ اخلاق وسیرت کی تعمیر ہو اور باکردار شہری پیدا ہوں۔

اسی بنا پر ہم حکومت کے ان قوانین وضوابط کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور ہیں جو آزاد دینی مدارس ومکاتب کے قیام اور ان کے آزادی سے تعلیمی خدمت اور علم وثقافت کی اشاعت اور مسلمانوں کو اپنے دین سے اس درجہ واقف کرانے کے کام میں خلل انداز ہوں جو ان کے لئے مذہبی طور پر ضروری ہے اور وہ تعلیم گاہیں یا تو قائم نہ ہوسکیں، یا اگر قائم ہیں تو باقی نہ رہ سکیں مثلاً کم سے کم تنخواہ ومعاوضہ (Minimum Wage) کا قانون یا مدارس ومکاتب کے لئے قیام و جواز کے لئے لائسنس لینے کی پابندی جو حکومت کے دوسرے شعبوں جن کا نظم ونسق (Administration) یا (Labour) سے تعلق ہے، کے لئے موزوں ہیں لیکن دینی مدارس ومکاتب کے لئے جن کا شعار اور طاقت وخصوصیات زمانہ قدیم سے لے کر اس وقت تک ایثار قناعت رہی اور ہمیشہ رہنا چاہیے، ناموزوں اور سخت مضرت رساں ہیں۔ ہم اپنا جمہوری، مذہبی، اخلاقی اور شہری حق سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف آواز بلند کریں کہ ملک کے دستور نے ہر اقلیت اور ہر اکائی کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنی پسند کے مدارس قائم کرے اور اپنی پسند اور صوابدید کے مطابق ان کو چلائے۔ ہم

خالص حب الوطنی اور ہندوستان کے لئے اس کو باعث فخر سمجھنے کی بنا پر بھی یہ کہتے ہیں کہ تعلیم وتربیت اور ثقافت وتہذیب کے پھیلانے میں ایثار وقربانی کی اس روایت کو جو ہندوستان کی قدیم تاریخ کا بھی طرۂ امتیاز رہا ہے، باقی رہنا چاہیے۔

آخر میں بڑی معذورت کے ساتھ ایک تلخ حقیقت کی طرف بھی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ان مدارس ومکاتب کے سرکاری الحاق اور سرکاری امداد قبول کر لینے کے بعد یہ اندیشہ ہے (جو واقعہ بن کر سامنے آگیا ہے) کہ ان مدارس کا عوام سے رابطہ بھی ٹوٹ جائے اور وہ مقصد بھی حاصل نہ ہو جس کے لئے سرکاری امداد اور ایڈ قبول کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے پٹنہ کے ایک جلسہ میں شرکت کے موقع پر جو امارت شرعیہ بہار کے قائم کردہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کی یادگار میں اسپتال کے افتتاح کے لئے منعقد کیا گیا تھا اور جس میں بہار کے چیف منسٹر بھی شریک تھے، ایک عربی مدرسہ کے ذمہ دار نے تقریر میں کہا کہ چھ مہینے سے ہم کو سرکاری امدادی رقم نہیں ملی، ہمارے بچے فاقہ کر رہے ہیں، یہ بہار کا حال جہاں اکثر مدارس عربیہ سرکاری امداد قبول کر چکے ہیں، ابھی چند ہی دن پہلے "قومی آواز" (لکھنؤ) میں جھانسی کے ایک دینی مدرسہ کے صدر مدرس یا مہتمم صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے، اس میں صاف لکھا گیا ہے کہ پانچ مہینے سے ہم کو سرکاری امداد نہیں ملی اور ہمارے بچے فاقہ کر رہے ہیں، ایسی حالت میں بڑے گھاٹے کا سودا ہوگا کہ ہمارا رشتہ عوام سے بھی ٹوٹ جائے اور ہم ان کی ہمدردی اور اعانت سے بھی محروم ہو جائیں اور حکومت کے تغافل یا اس کے نظم ونسق کی طوالت کا بھی شکار ہوں، اس طرح (بہت معذرت کے ساتھ) صرف اس مصرعہ پر اکتفا کروں گا کہ ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

میں ایثار وقربانی کی اس دعوت کے ساتھ جو کسی نہ کسی درجہ میں دینی تعلیم کی بقا وملت کے تشخص کی حفاظت کے لئے ضروری ہے، حقائق اور زندگی کی طبعی وفطری بلکہ شرعی ضروریات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا، مدارس ومکاتب کے اساتذہ ومنتظمین کے لئے بقدر ضرورت وباعزت معاشی انتظام کی بے شک ضرورت ہے، مدارس کے ذمہ داروں کو اس پر ہمدردانہ غور کرنا اور اس تقاضہ کو اپنے وسائل اور دائرہ اختیار میں رہ کر پورا کرنا ضروری ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ اور مدارس ومکاتب کے کارکنوں اور خدمت گذاروں کو کسی نہ کسی درجہ میں ایثار وقناعت کے اجر وثواب کی امید میں کام کرنے کے ساتھ اس چراغ کو روشن رکھنے اور اس کی روشنی دور دور اور دیر تک پہنچاتے رہنے کی کوشش وجانفشانی بھی جاری رکھنی چاہیے کہ اس دین کا ماضی، حال اور مستقبل ایمان ویقین، ایثار وتوکل اور عزم حالات اور تیز وتند آندھیوں میں بھی اس چراغ کو گل ہونے سے بچاتا رہا ہے اور بچاتا رہے گا۔ ؎

ہوا ہے گو تند وتیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

میں اقبالؒ کے اس شعر پر گذارش کا اختتام کرتا ہوں کہ ؎

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم